© rasailojaraid.com

عدم تشدّد

گاندھی جی کے ایک مکتوب پر تبصرہ

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاری

گاندھی جی نے ۱۱۔ نومبر ۳۹ء کے ہریجن میں "اختلاف رائے" کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے، یہ مضمون علی گڈھ کے ایک مسلمان کے مکتوب کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

اس مقالہ میں گاندھی جی نے اپنے عقیدہ "عدم تشدد" پر قرآنِ عزیز و سیرت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی خاص اسلوب اور پیرایۂ بیان کے ساتھ گواہ بنایا ہے۔

اس وقت ہمارا روئے سخن اُن کے تمام بیان کردہ مباحث سے قطع نظر صرف اسی مسئلہ سے متعلق ہے تاکہ ان سیاسی مباحث میں ایک مذہبی مسئلہ کی حقیقت کے متعلق نہ گاندھی جی کو غلط فہمی رہے اور نہ دوسروں کو۔

بحالات موجودہ تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ برسرِ اقتدار حکومت کے مقابلہ میں آزادی ہند کے لیے ہماری جنگ کا طریق کار صرف "عدمِ تشدد" ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس مسئلہ میں ایک مسلمان کو مذہبی روشنی حاصل کرنے کے لیے قرآنِ عزیز کی مکی زندگی کے احکام، اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مکہ کی سیرت کے واقعات کافی اور وافی شاہد عادل ہیں۔

لہذا ملک کے موجودہ حالات اور اسباب و واقعات کے پیش نظر عدم تشدد کا یہ عملی طریق کار "مذہبی اور سیاسی" دونوں اعتبار سے صحیح اور درست ہے لیکن گاندھی جی کی بحث صرف اس "نقطہ" ہی پر آکر نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھہر جاتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حسب ذیل "نتائج" ظاہر کرتی ہے ۔

(۱) عدم تشدد (اہمسا) طریق کار نہیں ہے بلکہ انسانوں کی اجتماعی اور اخلاقی بلکہ مذہبی اور سیاسی ہر قسم کی زندگی کے لیے نصب العین اور آخری فلسفۂ حیات ہے ۔

(۲) عدم تشدد کے نصب العین ہونے کے متعلق اُن کی یہ ریسرچ (تحقیق) ہے کہ قرآنِ عزیز کی تعلیم بھی یہی ہے ۔

(۳) کسی کتاب میں "خواہ وہ الہامی اور وحی الٰہی ہی کیوں نہ ہو" اگر ایسے احکام اور مضامین بھی موجود ہوں جو اُس کے بتائے ہوئے اصول کے خلاف ہوں تو ایسا ہونا ممکن ہے اور اس قاعدے کے پیش نظر اگر قرآن عزیز کی بعض آیات "عدم تشدد" کے خلاف نظر آتی ہیں تو چنداں مضائقہ نہیں ہے ۔

(۴) باوجود اس امر کے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن عزیز کو خدا کا کلام اور خود کو اُس کا نبی اور رسول کہتے ہیں پھر بھی قرآنِ عزیز کی بعض آیات کا آیات سے اختلاف، اور سیرت رسول کے بعض واقعات اور قرآنی تعلیم کے درمیان اختلاف ممکن ہے ۔

اگرچہ گاندھی جی کے مضمون میں الفاظ کی تعبیر اس طرح نہیں ہے جس طرح دفعات وار ہم نے کی ہے لیکن مفہوم مراد اور معنی کے اعتبار سے اُن الفاظ کا صرف یہی مطلب نکل سکتا ہے ۔

گاندھی جی نے ساتھ ہی یہ معذرت بھی کی ہے کہ چونکہ وہ غیر مسلم ہیں اور اُن کی کی ہوئی تفسیر مسلمانوں کے نزدیک ناقابلِ قبول ہوگی اس لیے وہ آیات کی تفسیر سے گریز کرتے ہیں ورنہ تو وہ قرآن عزیز کی آیات سے اپنے مقصد کو ثابت کر سکتے ہیں ۔

ہم کو اُن کے مضمون کے مسطورۂ بالا "نتائج" اور "معذرت" دونوں سے اختلاف ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ترتیب وار ان کو واضح کریں اور بتائیں کہ اس مسئلہ کی "اصل حقیقت کیا ہے ؟

عدم تشدد نصب العین نہیں ہے، طریق کار ہے "تشدد یا عدم تشدد" ایک ایسا "عمل" ہے جو فرد یا جماعت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے درمیان جانبین کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس عمل کا تعلق تنہا ایک شخص کی انفرادی زندگی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات نیک و بد کے لیے دو جانبوں کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا عقلی او فطری تقسیم کے پیشِ نظر ان ہر دو جانب کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں (۱) یا دونوں کے درمیان قوت وضعف میں مساوات ہے (۲) یا دونوں میں تفاوت اور فرق ہے۔ پس اگر ایک، دوسرے پر ظلم وتعدی کرے اور جائز حقوق کو پامال کر کے اُس کی عافیت تنگ کر دے تو ایسی حالت میں دوسرے کو اس کے جواب اور ردعمل کے لیے "عقل اور فطرت" کا قانون کیا فیصلہ دیتا اور "اخلاقی حکم" اس کے بارہ میں کون سی راہ بتاتا ہے؟ اور پھر عقل وفطرت یا اخلاقی حکم ایسے شخص یا ایسی جماعت کے لیے جو بھی فیصلہ دیتے ہوں بحث طلب بات یہ ہے کہ اُس کی اس مقاومت اور ردعمل کی زندگی کے لیے "یہ فیصلہ" ایک طریق کار ہے یا نصب العین؟

یہ دو مسئلے ہیں جن کو سب سے پہلے "عقل" کی ترازو میں تولنا اور فطرت کے پیمانہ سے ناپنا ضروری ہے۔ اس کے بعد اس پر غور وفکر کو متوجہ کرنا آسان ہے کہ اسلام نے اس کے متعلق کیا پیغام دیا ہے اور آیا وہ "پیغام" فطرت وعقل کے عین مطابق ہے یا مخالف۔

علم اخلاق (Ethics) اور علم نفسیات (Psychology) کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قوائے طبیعی ( ) کو بالکل فنا کر دینا اور مٹا دینا قطعاً ناممکن اور محال ہے، اس لیے کہ جس قادرِ مطلق ہستی نے انسان کو وجود سے نوازا اور مشرف کیا ہے اُس نے بدءِ فطرت اور وجودِ انسانی کے وقت ہی سے ان قویٰ اور ملکات کو اُس کے خمیر میں گوندھ دیا ہے لہذا انسان اور بشری طاقت سے یہ باہر ہے کہ وہ اس کو فنا کر دے اور اُن کے مقابلہ میں دوسرے ملکات کو عالم وجود میں لے آئے یا اُن کی ماہیت اور حقیقت کو تبدیل کر کے ان کے لیے کوئی دوسری حقیقت تجویز کر دے۔ البتہ اُس کو یہ اختیار بخشا گیا ہے کہ وہ اپنے عمل اور کردار میں اُن کو صحیح یا غلط طریقہ پر استعمال کر سکے اور اُن سے اچھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا جرا کام لے سکے۔

اسی کے ساتھ علم الاجتماع (Ethics) اور علم الاخلاق کا یہ بھی متفقہ مسئلہ ہے کہ افرادِ انسانی میں ہر فرد "جماعت" کا ایک عضو ہے اور جماعت اُس کا مکمل پیکر" اور یہ کہ جماعتی زندگی کی ترقی کا آخری نقطہ یہ ہے کہ تمام عالمِ انسانی جغرافیائی، نسلی، قومی، وطنی، اور ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک اور صرف ایک برادری بن جائے جس کا ہر فرد دوسروں کی طرح یکساں حقوق کا مالک ہو اور جماعتِ انسانی کا مکمل پیکر اپنے ہر ایک عضو اور فرد کی حیاتِ کامل کے لیے یکساں کفیل و ضامن۔

اسی طرح یہ امر بھی غیر اختلافی ہے کہ انسان کے فطری ملکات اور طبیعی قویٰ میں "قوتِ غضبیہ" بھی ایک قوت اور ملکہ ہے جو اُس کی ذات اور اُس کے حقوق کو دوسروں کی دستبرد سے بچاتی اور محفوظ کرتی ہے۔

پس جس انسان میں یہ قوت حدِ اعتدال سے کمزور پڑ جاتی ہے تو وہ خودداری کے شرف سے محروم، اور پستی و خواری سے دوچار ہو جاتا ہے اور جس شخص میں حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جاتی ہے وہ وحشی اور درندوں کی طرح بربریت اور ظلم و تعدی کا پیکر بن جاتا ہے۔

لہٰذا ان ہر سہ متفقہ مسائل کے پیشِ نظر عقل اور فطرت کا یہ قانون نہ ہے کہ انسان جب کبھی ظلم و تعدی کا شکار ہو تو اگر وہ اس کے دفاع اور ردِ عمل کی طاقت نہیں رکھتا۔ تب اُس کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ ہرگز مقاومت اور ردِ عمل کا وہ طریقہ اختیار نہ کرے جس سے ظلم دفع ہونے، اور ظالم کی قوت شکست ہونے کے بجائے خود اُس کی ہستی ہی مٹ جائے اور اسی طرح دوسروں کو برباد کرنے کے لیے ظالم کی طاقت میں اور اضافہ ہو جائے۔ بلکہ صبر و ضبط کے اسلحہ کو کام میں لا کر ایسی مقاومت اور ایسے ردِ عمل کو اختیار کرے جس کے نتیجہ میں ظالم کی ظالمانہ طاقت کو صدمہ پہنچے، اور آہستہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آہستہ شکست ہو کر مظلوم کو آزادانہ اور مساویانہ زندگی میں سانس لینا نصیب ہو۔

اور اگر برابر کی طاقت یا ایسی کمزور طاقت کا مالک ہے جو مساویانہ نبرد آزمائی اور مقاومت و مقابلہ کے لیے اُس کے غالب گمان میں کافی ہے، اور ماحول کے اثرات سے وہ غالب کو مغلوب کردینے پر قادر ہے تو اُس کے لیے انفرادی زندگی میں دونوں راہیں کشادہ ہیں یہ کہ اپنا نقصان برداشت کرے، خود کو مصائب و آلام کا شکار بنائے، اور مخالف کو عفو، اور درگذر کے اخلاقی اسلحہ سے فتح کرے، اور ظالم کو ظلم سے رستگاری دلائے۔

یا مادی قوت و طاقت کے ذریعہ صرف اُس حد تک مقابلہ کرے جس حد تک ظالم نے ابتدا کی ہے اور اُس سے ایک شوشہ زیادہ بھی اس میں اضافہ نہ کرے تاکہ بدلہ اور انتقام کی اسپرٹ میں کہیں یہ خود ظالم نہ بن جائے۔

اور اگر یہی "صورت" اجتماعی زندگی کے مقابلہ میں پیش آئے تو پھر یہ دیکھنا فرض اور ضروری ہوگا کہ طلب حق یا مدافعت ظلم، یا انتقام حق کے لیے کونسی راہ جماعت کے مفاد کے لیے بہتر اور انسب ہے اور کونسی راہ مضر اور نقصان دہ۔

پس اگر عفو و درگذر اور صلح و آشتی کے ذریعہ کامیابی متوقع ہے تو وہ صورت اختیار کی جائے اور اگر عدم تشدد کے طریق کار سے مقاومت اور مدافعت مناسب ہو تو اس کو کام میں لایا جائے، اور اگر ایسے سم آلود عضو کو کاٹ دینا، اور مادی اسلحہ کے تریاق سے اس زہر کو بجھا کر جماعت کو بچالینا ضروری نظر آئے تو ایسا کرنا نہ صرف مناسب اور مفید ہے بلکہ وقت کا اہم فریضہ ہے۔

قدیم و جدید اہلِ عقل کا یہ فیصلہ "واقعاتی اور عملی زندگی" میں ہمیشہ کامیاب رہا ہے اور اس کے خلاف ایک مختصر سے علماءِ اخلاق نے جب کبھی یہ آواز بلند کی ہے کہ ہم کو مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ ان قوائے طبعی کو موت کی نیند سلا دینا چاہیے تو سلیم الفطرت علماءِ اخلاق کی کثیر جماعت نے ہمیشہ اُن کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نظریہ کو علم و عمل کی روشنی میں ناکام ثابت کر دکھایا، اور یہ واضح کر دیا کہ قوائے طبیعی کے وجود سے جنگ کرنا خود فطرت اور خالقِ فطرت کے ساتھ جنگ کرنا ہے اور اس کا نتیجہ خوبصورت خواب اور حسین خیال کے سوا دنیائے علم و عمل میں بے حقیقت و بے بنیاد ہے۔

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے اُس نے بھی انفرادی و اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں کو اخلاق کے ان ہی فطری اور عقلی اصولوں پر قائم کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک ہونے چاہئیں، انسانیت کا جو رشتہ اپنے خالق کے ساتھ ہے وہ بغیر امتیاز کے سب کے لیے یکساں ہے، اس لیے قومیت، وطنیت، نسلی اور خاندانی امتیازات، تعارفِ باہمی کی حد تک اگرچہ قابلِ قبول ہیں لیکن اعمال و کردار، فضائل و رذائل، معاونت و مناصرت، اور اعتقاد و ایمان کی حدود میں ناقابلِ قبول اور خود ساختہ صنم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لہٰذا اُس کی دعوت و ارشاد کا نصب العین یہ ہے کہ تمام عالمِ انسانی اعتقاد و ایمان اور اخلاقی کردار و اعمال میں ایک ہی نقطہ پر جمع ہو جائیں، اور اُن کے درمیان کوئی دوئی باقی نہ رہے۔ ہر فردِ انسان دنیا کی تمام انسانی برادری کو اپنا پیکر اور جسم یقین کرے اور کل دنیائے انسانی ہر فردِ انسان کو اپنے پیکر و جسم کا ایک کار آمد عضو تصور کرے۔

اسی وسعتِ نظر اور بلندیٔ فکر کا نام علم الاخلاق میں "مثلِ اعلیٰ" ہے، اور یہی انسان کی اخلاقی زندگی کا آخری مقصد ہے۔ اسی لیے قرآنِ عزیز نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق یہ تصریح کی ہے۔

وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرا	اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ہم نے تم کو تمام انسانی برادری کے لیے یکساں پیغامبر بنا کر بھیجا ہے، آپ سب کے لیے اچھے کردار پر بشارت دینے والے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نذیراً (سبا) اور بُرے کردار پر ڈرانے والے ہیں۔

اور اس پیغام سے متعلق آپ کی ذاتِ اقدس کی حقیقی صفت کا اس طرح اظہار فرمایا ہے۔

وما ارسلناك الا رحمة للعلمین۔ (انبیاء) اور ہم نے تم کو کل جہان کے لیے "رحمت" بنا کر بھیجا ہے

اور خود ذاتِ اقدس نے اپنی بعثت اور مقصدِ نبوت و رسالت کو ان حکیمانہ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔

انی بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ کریمانہ کو

(او) محاسن الاخلاق (الحدیث) حدِ کمال تک پہنچاؤں۔

اسی لیے اسلام نے کسی حالت میں بھی اخلاقِ کریمانہ کے اصول سے ہٹ کر ظلم و عدوان یا تشدد و سختی پر اپنی "دعوت و تبلیغ" کی اساس کو قائم نہیں کیا اور اس نے اس کے لیے صرف ایک ہی اصول بیان کیا ہے۔

ادع الی سبیل ربك بالحکمة اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلاؤ حکمت و دانائی

والموعظة الحسنة وجادلهم کے ساتھ، اور اچھی اچھی نصیحتوں کے ذریعہ، اور اُن

بالتی هی احسن۔ (النحل) (مخالفوں) سے بحث و مباحثہ کرو اچھے طریقہ اور بہتر

رویّہ کے ساتھ۔

البتہ جب کوئی شخص یا فرد یا عالمِ انسانی کی چھوٹی بڑی جماعت اخلاق کی اس بلند پایہ تعلیم (اخوتِ عامہ) کے خلاف علم بغاوت بلند کرے، اور اس راہِ صداقت میں راہ کا پتھر بنے تو اب داعیِ حق و صداقت کا فرض ہے کہ وہ غور کرے کہ اس مقصدِ اعلیٰ اور اجتماعی نصب العین کے بقا و تحفظ کے لیے یا راہ کا پتھر ہٹانے کے لیے کونسا طریقِ عمل مفید ہے۔ اور جس کو مفید سمجھے اختیار کرے۔

مکّی معظمہ کی تمام زندگی میں نبیِ امی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رفقاء (صحابہ رضی اللہ عنہم) کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآنی تعلیم نے صرف صبر و ضبط، عفو و درگذر، اور عدم تشددانہ مقاومت و مقابلہ ہی کو جماعتی فلاح کے لیے ضروری قرار دیا۔ اور آپ نے اور آپ کے تمام فداکاروں نے اسی کو اپنا اسوۂ عمل بنایا۔ اور مکہ معظمہ سے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں قوت و طاقت آجانے کے بعد بھی ان ہی اخلاقی اسلحہ کا استعمال باقی رہا۔ مدنی غیر مسلموں (یہود و نصاریٰ) کے ساتھ بغیر جنگ و جدل کے ابتدائی معاہدات اور صلح و آشتی کی روش بھی اسی حکم کی ایک فرع اور شاخ ہے۔

لیکن مخالفوں کی معاندانہ روش، اور مقصدِ اعلیٰ کو تباہ و برباد کرنے کے ناپاک جذبے نے جب خوفناک صورت اختیار کرلی، اور دعوت و تبلیغ کے لیے اُن کی رُکاوٹیں بلکہ اُن کی ہستیاں مستقل خطرہ، اور مہلک خطرہ بن گئیں تب اسلام نے یہ فیصلہ دیا کہ اب صبر و ضبط، عفو و درگذر، اور عدم تشدد کا طریق کار آپ کے ذاتی اخلاق کی سربلندیوں کے لیے کتنا ہی حسین اور خوبصورت شاہکار کیوں نہ معلوم ہوتا ہو لیکن خالقِ کائنات کے نزدیک اس زہرزدہ عضو کی قطع و برید واجب ہے اور یہ نہ صرف اخلاق کے اس اعلیٰ پیغام کو فتنہ و فساد سے بچانے کے لیے ضروری ہے بلکہ عالم انسانی کے امنِ عام کی بہتری و بہبودی کے لیے بھی بیحد ضروری ہے۔ اور اس لیے اپنے فداکاروں کو مادی طاقت کے مقابلہ میں مادی طاقت کے استعمال کی یہ کہہ کر اجازت دی۔

اُذن للذین یقٰتلون بأنھم	جن لوگوں سے ناحق لڑائی کی جاتی ہے اُن کو
ظلموا، وان اللہ علیٰ نصرھم	اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ اُن پر
لقدیر، الذین اخرجوا من	ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ اُن کی مدد کرنے پر
دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا	قادر ہے۔ اُن کو جو ناحق اپنے گھروں سے نکالے گئے
ربنا اللہ ولولا دفع اللہ	صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار
الناس بعضھم ببعض لھدمت	اللہ ہے اور اگر اللہ کا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صوامع وبیع وصلوات و — سے دفع کرتا نہ ہوتا تو ضرور درویشوں کے خلوت خانے

مساجد یذکر فیھا اسم — اور گرجے اور یہودیوں کے صومعے اور مسجدیں جن

اللہ کثیراً ولینصرن اللہ — میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے گرا دیے جاتے

من ینصرہ ط ان اللہ لقوی — اور اللہ اُس کی ضرور مدد کریگا جو اُس کی مدد کرتا ہے

عزیز. (الحج) — بیشک اللہ قوت والا ہے غالب۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین — اور اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں

یقاتلونکم ولا تعتدوا ط ان اللہ — اور اپنی طرف سے زیادتی نہ کرو بیشک اللہ حد سے

لا یحب المعتدین. ( ) — باہر نکلنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

کتب علیکم القتال وھو کرہ — تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے

لکم وعسیٰ ان تکرھوا شیئاً — اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے

وھو خیر لکم ج وعسیٰ ان تحبوا — حق میں بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور

شیئاً وھو شر لکم ط واللہ — وہ تمہارے حق میں بُری ہو، اور اللہ جانتا ہے اور

یعلم وانتم لا تعلمون (بقرہ) — تم نہیں جانتے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اسلام نے جماعتی فلاح وبہبود اور امنِ عام کی حفاظت کے لیے جس لڑائی کی اجازت دی اُس کا نام تشدد، جنگ، یا اس قسم کا کوئی دوسرا نام تجویز نہیں کیا، بلکہ "جہاد" کہہ کر پکارا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان جنگوں کا مقصد محض جنگ اور تشدد نہیں ہے۔ بلکہ اصل مقصد" اعلاءِ کلمۃ اللہ اخوتِ عامہ کی تکمیل کے لیے جد وجہد کا ایک خاص طریقہ کار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اس جنگ کا مقصد صرف طمع دولت، دوسروں پر بیجا ہلاکت آفرینی، اور دنیا طلبی ہو تو وہ جہاد نہیں ہے بلکہ ناپاک جنگ ہے جو ملکِ عضوض (کاٹ کھانے والی حکومت) کی خاطر لڑی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تمام تفصیل و تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تشدد یا عدم تشدد خود نہ کوئی نصب العین یا مقصد ہیں اور نہ یہ اخلاقی فلسفہ کی کوئی شاخ، بلکہ یہ دو طریقہائے کار ہیں جو نیک اور بد دونوں مقاصد کے لیے استعمال کئے جا سکتے ہیں، پس اگر مقصد نیک ہے تو حسب موقعہ مفادِ عامہ کے اعتبار سے دونوں طریقے عملِ نیک شمار ہونگے۔ اور اگر مقصد بُرا اور ناپاک ہے تو اُس کے لیے عدم تشدد (اہنسا) بھی اُسی طرح بُرا عمل ہے جس طرح تشدد (ہنسا) یعنی مادی طاقت کا استعمال۔ نیز تشدد و عدم تشدد کے درمیان خیر اور شر کے تناسب کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ مثلاً ایک فرد یا ایک جماعت، فتنہ و فساد کی درپے ہے اور امنِ عام اور حق و صداقت کے لیے مہلک خطرہ بنی ہوئی ہے تو ایسی حالت میں اگر مادی طاقت (تشدد) کا طریقہ اختیار کر کے اُس کو فرو کیا جائے تو بہت آسانی کے ساتھ فرو ہو جا سکتا ہے، اور اگر عدم تشدد (اہنسا) کے ذریعہ اُس کو ختم کرنے کی سعی کیجائے تو نصف صدی صرف ہونے کے بعد کامیابی کی توقع ہوسکتی ہے تو ایسی صورت میں عدم تشدد کے طریقہ کو استعمال کرنا خیر نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس لیے کہ نصف صدی کے اس درمیانی حصہ میں ظالم اور فتنہ ساز کے تمام مظالم اور فتنوں کے ایک طرح وہ بھی ذمہ دار ہونگے جو تشدد پر طاقت رکھنے اور اُس کی کامیابی کے متیقن ہونے کے باوجود اُس سے گریز کر کے ظالم کو ظلم کی فرصت دیتے رہے۔ اور بلا شبہ اس حالت میں مادی اسلحہ کی طاقت کا استعمال ضروری ہو جائیگا۔ جس کو گاندھی جی تشدد کہتے ہیں اور اسلام "جہاد" سے تعبیر کرتا ہے۔

گاندھی جی اور قرآنی ریسرچ

اس تفصیلی بحث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ گاندھی جی کی یہ ریسرچ (تحقیق) کہ قرآن مجید صرف عدم تشدد ہی کی تعلیم دیتا ہے اور بس، صحیح نہیں ہے، خود قرآنِ عزیز کی مکمل تعلیم اُن کے اس دعوے کو غلط ثابت کرتی ہے۔

اس میں عفو و درگذر اور عدم تشدد کے بھی احکام ہیں جو مکی اور مدنی دونوں قسم کی صورتوں یعنی سورۂ مائدہ کے رکوع (۱) اعراف کے رکوع (۲۴) النحل کے رکوع (۱۶) الحج کے رکوع (۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

المومنون کے رکوع ۵، الشوریٰ کے رکوع ۴ - اور تغابن کے رکوع ۱ میں مفصل درج ہیں - اور اُس میں تشدد اور جہاد" کے احکام بھی موجود ہیں، اور اسی قرآنِ عزیز نے فرضیت جہاد کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی صاف کر دیا ہے کہ "مسئلہ جہاد" تا قیامِ قیامت اپنی فرضیت پر قائم و دائم رہیگا اور اسی طرح اخلاقِ کریمانہ کے احکام "عفو و درگذر اور صبر و ضبط" بھی حالات و واقعات کی روشنی میں ابدی و سرمدی ہیں اور یہ کہ وہ تشدد و عدم تشدد کو طریق کار تسلیم کرتا ہے اور مقصد و نصب العین کی حیثیت نہیں دیتا۔

اور اسی لیے گاندھی جی کا یہ قول کہ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اُن کی تفسیر ناقابلِ قبول ہوگی ورنہ تو وہ قرآن عزیز سے اس دعویٰ کو ثابت کر دکھاتے" درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ کے قبول و عدم قبول کی یہ بحث مسلم اور غیر مسلم کے امتیاز سے زیادہ تعلق نہیں رکھتی بلکہ قرآن دانی کے لیے جن علوم کی معلومات شرط ہے اور ریجا شرط ہے اُس پر موقوف ہے پس اگر ایک مسلم بھی اُن علوم سے ناآشنا ہے تو وہ بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ قرآنِ عزیز کی تفسیر کر سکے کیونکہ وہ بلاشبہ غلطی کھائیگا اور گمرہی کا باعث بنیگا۔

وحی الٰہی میں باہمی تضاد اور مخالفت

عقل و فطرت کا یہ صاف اور روشن فیصلہ ہے کہ اہلِ عقل کے کلام میں باہمی تضاد اور مخالفت نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ ایسا متضاد کلام یا صاحبِ کلام کے نقصانِ عقل پر دلالت کرتا ہے یا لاچاری و مجبوری پر۔ تو پھر گاندھی جی کا یہ مقولہ کس قدر حیرت زا ہے کہ اُن کے نزدیک خدائے تعالیٰ کے احکام میں اگر ایسی مخالفت نظر آئے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔

البتہ اس حیرت کو دور کرنے کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ گاندھی جی درحقیقت کسی کلام کے "کلامِ الٰہی" ہونے کے صحیح تصور سے اس لیے عاجز ہیں کہ اُن کی اعتقادی تعلیم "وحی الٰہی" کے نزول کی اس حقیقت کو قطعاً واضح نہیں کرتی جس کا اعتقاد و یقین اسلام کے معتقدات میں اسلامیت کی پہلی شرط ہے۔ قرآنِ عزیز بانگ دہل اعلان کرتا ہے :-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افلا یتدبرون القرآن ولو کان — کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے اور اگر وہ اللہ کے سوا
من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ — کسی اور کے پاس سے آتا تو اس میں طرح طرح
اختلافاً کثیرا ( ) — کے اختلافات پاتے۔

یعنی جبکہ خدائے تعالیٰ عالم غیب وشہادت ہے اور قادر مطلق بھی تو پھر یہ ناممکن ہے کہ اس کے کلام میں اختلافات ہوں، اختلافات تو بلاشبہ جہل ونادانی، اور بیچارگی ومجبوری سے پیدا ہوتے ہیں۔

قرآنی تعلیم اور سیرتِ رسول

اسی طرح گاندھی جی کا یہ نظریہ بھی دور از عقل وخرد ہے کہ خدا کے سچے پیغمبر اور رسول کی زندگی کے بعض واقعات کلام الٰہی کی تعلیمات کے خلاف ہوسکتے ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا گاندھی جی کا یہ نظریہ بھی غالباً اس غلط اعتقاد پر مبنی ہے کہ خدا کے پیغمبر کی حیثیت ایک ریفارمر اور مصلح کی برابر ہے۔

کیونکہ بلاشبہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ ایک ریفارمر "مصلح" کی تمام زندگی کے باہمی حصوں میں پوری مطابقت نہ پائی جائے بلکہ بعض مرتبہ ایک دوسرے کے خلاف نظر آئیں لیکن اسلام نے "پیغمبر" اور "نبی ورسول" کے متعلق جو عقیدہ بتایا ہے اور جو یقیناً ایک سچے مذہب کے لیے از بس ضروری ہے وہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کا کلام اور وحی الٰہی ایک "قانون" ہے۔ اور جس نبی پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے وہ اُس کا ایک مکمل عملی نمونہ ہے۔ تاکہ معاش ومعاد کے ہر شعبہ میں قانون اور عمل کے درمیان عدم مطابقت کی وجہ سے عالم انسانی ضلالت وگمراہی میں نہ پڑجائے اور خود نبی ورسول کی ذات بھی "بے عملی یا کذب" جیسی قبیح صفات سے بری اور پاک رہے۔ اس لیے قرآن عزیز نے اپنے پیغامبر صلی اللہ علیہ کا یہ طغرائے امتیاز بیان کیا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ — لاریب تمہارے لیے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ

۱۷۹۷۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حسنۃ لمن کان یرجوا اللّٰہ والیوم موجود ہے یہ اُس شخص کے لیے جو اللہ اور اُس کے

الآخر (احزاب) آخرت کے دن پر اُمید لگائے ہوئے ہو۔

اس لیے "ریفارمر" اور نبی کی زندگی کے درمیان اس اعتبار سے بہت بڑا تفاوت ہے جس ہستی کے لائے ہوئے قانونِ الٰہی کے خلاف خود اُس کی اپنی زندگی کے واقعات ہوں وہ ہرگز معصوم اور دنیا کے لیے اُسوہ (نمونہ) نہیں ہوسکتی، اور بلاشک و ریب وہ نبی اور "پیغمبر" ہونے کے بھی لائق نہیں ہے۔ یہ منصبِ عظمیٰ صرف اُسی کو ملتا ہے جس کا ہر حرکت وسکون "وحی الٰہی" کے سانچہ میں ڈھلا ہو۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس لیے کہتا ہے کہ خدا کا فرمودہ ہے۔

وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الّا اور وہ اپنی نفسانی خواہش سے کچھ نہیں بولتا،

وحی یوحیٰ (النجم) وہ صرف خدا کی وحی بیان کرتا ہے۔

اور وہ جو کچھ کرتا ہے خدا کے زیر فرمان کرتا ہے۔

وما رمیت اذ رمیت اور تم نے نہیں پھینکا، جو کچھ تم نے دشمن کی طرف مٹھی بھر کر پھینکا وہ تو خدا کی

ولکن اللّٰہ رمیٰ (انفال) طاقت نے تمہارے ہاتھ سے کام کیا ہے۔

اِن مسائل کے علاوہ گاندھی جی نے دو جملے اپنے اس مکتوب میں اور تحریر فرمائے ہیں جو قابلِ لحاظ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"جس طرح مجھے اپنے مذہب کا احترام ہے، اُسی طرح مجھے اسلام اور دوسرے مذاہب کا بھی احترام ہے"

چونکہ ہم کو "احترام" کے اس مسئلہ سے بھی غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے اس کو بھی واضح کردینا مناسب ہے۔

اگر گاندھی جی کا اس سے یہ مقصد ہے کہ وہ اپنے مذہب کی طرح تمام مذاہب کو حق اور اُس کی تمام تعلیمات کو سچا سمجھ کر اُسی طرح اُن کا بھی احترام کرتے ہیں جس طرح اپنے مذہب کا۔ تو ہم اگرچہ گاندھی جی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اس عقیدے سے ہٹانے کا حق نہیں رکھتے لیکن اُن پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد اور سیاسیاتِ ملکی و وطنی میں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ایک قوم ہونے کے جواز کو تسلیم کرنے کے باوجود اسلامی تعلیم ہرگز کسی مسلمان کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ دوسرے مذاہب کا گاندھی جی کے بتائے ہوئے معنی سے احترام کرے۔

اس سلسلہ میں "اسلام" کا صاف اور سادہ عقیدہ یہ ہے کہ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ دنیا ءِ انسانی کی اِبتداء سے خدا کی بھیجی ہوئی روحانی روشنی (مذہب) ایک ہی قسم کے اصولوں پر قائم ہے جس کے مجموعہ کا نام "اسلام" ہے، اگرچہ زمانہ اور وقت کے اعتبار سے اُس کے مختلف نام ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ اور یہ کہ خدا کے اس نور کے لانے والے پیغمبر ہمیشہ دنیا کے مختلف گوشوں میں آتے رہے ہیں

وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر۔ (فاطر) — کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جہاں ہماری جانب سے بُری راہ سے ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

منھم من قصصنا علیك و منھم من لم نقصص علیك (مومن) — اُن رسولوں میں سے بعض کے واقعات ہم نے تجھ پر بیان کر دیے ہیں اور بعض کے بیان نہیں کیے۔

اس لیے ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے۔

لا نفرق بین احد من رسلہ (بقرہ) — ہم خدا کے سچے بھیجے ہوئے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی (ایمان لانے میں) فرق نہیں کرتے۔

اور ان ادیان و مذاہب میں اُن کے ماننے والوں کی من مانی کتر بیونت اور تحریف کی بدولت جب اصل سچائی معدوم ہونے لگی تو خدا نے اُس کو آخری اور مکمل قانون کی شکل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے "اسلام" اور "قرآنی تعلیم" کے نام سے بھیجدیا۔ اور اب گذشتہ یہودیت، نصرانیت، اور دیگر ممالک کے سچے مذاہب کی صحیح تعلیم کی شکل صرف اسی "اسلام" اور "قرآنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیم میں منحصر ہے۔ باقی سب محرّف اور نا قابل قبول مذاہب ہیں۔

ان الدین عند اللہ الاسلام — بلا شبہ خدا کا (پسندیدہ) دین اسلام ہی ہے اور جو

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا — شخص اس اسلام کے سوا دوسرا دین تلاش کرتا ہے خدا

فلن یقبل منہ (آل عمران) — کے یہاں وہ قطعاً نا مقبول ہے۔

اس لیے اسلام جو خدا کی توحید میں ادنیٰ شائبۂ شرک کو برداشت نہیں کر سکتا اُس مذہب کے احترام کی اجازت کیسے دے سکتا ہے جس میں خدا کے لیے بیٹا یا بیٹی تجویز کیا جاتا یا اُس کی مخلوق کو اُسی کی طرح معبود مانا جاتا ہو اور اس طرح کھلے ہوئے شرک کو اختیار کیا گیا ہو۔

اسلام کہتا ہے کہ صداقت ایک ہی ہو سکتی ہے اور ایک ہی ہے، اور جس طرح دن کی روشنی رات کی تاریکی نہیں ہو سکتی اُسی طرح توحید اور شرک میں یگانگت ناممکن اور محال ہے۔

اور اگر گاندھی جی کے نزدیک اس احترام کے معنی دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری اور مذاہب کے پیشواؤں کے ساتھ باعزت برتاؤ کے ہیں۔ تو یہ عین اسلام کی تعلیم ہے اور اسلام کسی سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ خود ہی بنیادی طور پر غیر مہذب اور دل آزار رویہ کو ناپسند اور ناجائز قرار دیتا ہے۔ اور رواداری کی تعلیم کا "امام" ہے بلکہ آج سے صدیوں پہلے ہندوستان کے علمائے اسلام اور صوفیائے کرام نے بعض سوالات کے جواب میں رام چندر جی، کرشن جی اور مہاتما بُدھ کے لیے یہاں تک لکھا ہے کہ ان حضرات کے متعلق ایک لفظ بھی خلافِ شان نہ کہا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ سب خدا کی جانب سے بھیجے ہوئے ہوں اور بعد میں ان کے مقلدوں نے اُن کی تعلیمات کو شرک کی تعلیمات سے بدل دیا ہو۔ کلماتِ طیبات میں مرزا مظہر جانجاں رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب اس سلسلہ میں قابل مطالعہ ہے۔ قرآن عزیز صاف یہ کہتا ہے۔

لا تسبوا الذین یدعون من — (مشرکین) اللہ کے سوا جن بتوں کو پوجتے ہیں تم اُن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم ۔ (الانعام) کے لیے بدگوئی نہ کرو کہ پھر وہ ناسمجھی میں عداوت کی راہ سے خدا کو گالیاں دینے لگیں۔

معرکۂ جنگ جیسے اہم موقعہ عداوت میں بھی دوسرے مذاہب کے اُن پیشواؤں کے ساتھ بُرے سلوک سے اسلام نے سختی سے روکا ہے جو بے خطر اپنے مذہب کے مطابق خدا کی یاد میں مشغول ہوں۔ اور اسی طرح اُن کے معابد کی تخریب سے بھی باز رکھا ہے۔

اور متضاد عقائد رکھنے والے اہل مذاہب کے درمیان یہی دوسرا طریقہ صحیح اور مطابقِ عقل ہے اور نقطۂ یہی عملی زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی کا دوسرا جملہ "متحدہ قومیت" سے متعلق ہے۔ ہم اس وقت اس مسئلہ میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ملکی اور وطنی سیاسیات اور آزادی ہند کے مسئلہ میں بلاشبہ ہندوستان کے تمام باشندے بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستانی اور ایک قوم ہیں۔ لیکن مذہب اور مذہبی معاشرت کے اعتبار سے اقوام ہند کا ایک قوم ہونا صحیح نہیں ہے اور نہ اسلام مسلمانوں کو اس کی اجازت دے سکتا ہے۔

مذہب کی مثال تو ابھی بیان ہو چکی مذہبی معاشرت کی مثالوں میں سے "ازدواجِ بین الملل" کو لیجیے۔ اس مسئلہ میں سیاسی اختلافات کے باوجود کانگریسی ہو یا مسلم لیگی یا مہا سبھائی ہندو اور مسلمان دونوں میں ایک جماعت ایسی موجود ہے جو سول میرج کو ہر حیثیت سے جائز سمجھتی ہے اور دوسری جماعت جس میں ہندوستان کی اقوام کی اکثریت شامل ہے اس کو ناپسند کرتی ہے۔

لیکن کوئی مسلمان پسند کرے یا نہ کرے "اسلام" ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو جائز نہیں رکھتا۔ (علیٰ ہٰذا القیاس) البتہ دنیوی طرزِ بود و ماند اور دوسرے دنیوی معاملات میں کہ جن کے متعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

انتم اعلم بامور دنیاکم تم اپنے دنیوی امور میں خود زیادہ واقف کار ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جو ہندو مسلم اتحاد اور باہم یکجہتی اور ملکی ترقی اور آزادی ہند کے لیے مفید اور ضروری ہوں مسلمانوں کے لیے دوسری قوموں کے ساتھ اتحاد میں کوئی مذہبی رکاوٹ نہیں ہے لیکن اس کے لیے بھی یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس بہتر مقصد کے لیے باہمی اعتماد و رضا پہلی شرط ہے۔

نہیں کہا جاسکتا کہ گاندھی جی کی متحدہ قومیت سے کیا مُراد ہے وہ جو اسلام میں جائز ہے یا وہ جو ناجائز ہے یہ وہ خود فیصلہ کریں، اسلام کا فیصلہ تو غیر متبدل اور غیر متزلزل فیصلہ ہے۔

اس تمام بحث و نظر کے بعد یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہنی چاہیے کہ اس مضمون میں جو کچھ سپرد قلم کیا گیا ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی ہے۔ رہا مسلمانوں کی موجودہ علمی اور ذہنی زندگی اور اُن کے پاکستانی افکار و آرا کا معاملہ سو اس کے متعلق سرِدست تو صرف یہی کہا جاسکتا ہے

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا!

کلام عرشی

© rasailojaraid.com